ہماری ویب ڈیجیٹل بک

اے آر اخلاص

A.R IKHLAS

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "A.R Ikhlas"
at Hamariweb.com

قسمت

قدرت نے اس کائنات کو ایک خاص نظم و ضبط کا پابند بنایا ہے۔ اور اس کائنات میں موجود ہر چیز کی قسمت لکھ رکھی ہے، ہر چیز ایک طے شدہ راستے پہ سفر کر رہی ہے۔ نقطہ آغاز سے انجام تک کا سفر اُس کی قسمت ہے۔ اگر وہ دیئے گئے نظم و ضبط کی پابندی کرتی ہوئی نقطہ آغاز سے انجام کی طرف رواں دواں ہے تو وہ خوش قسمت مگر جیسے ہی وہ فطرت کے بنائے گئے قانون کے خلاف چلی تو بد قسمت، یہ بد قسمتی دراصل تباہی و بد حالی ہے۔ مثلاً اگر کبھی ہماری زمین نظام شمسی سے کٹ جاتی ہے اور اپنے مدار سے باہر نکل جاتی ہے تو عین اُسی لمحے اس کی بد قسمتی شروع اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں موجود تمام مخلوق اور تمام سیٹ اپ تباہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس (زمین کے) پورے نظام کو ایک واحد اکائی کی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ اس لیے ایک کڑی دوسرے سے باہم ملی ہوئی ہے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ایک کی قسمت دوسرے کی قسمت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اگر کسی خاندان کا سربراہ صاحب مال و ثروت ہے تو اس کے زیر کفالت تمام افراد خوش قسمت گردانے جائیں گے۔ اور اگر کسی ملک کا سربراہ امورِ سلطنت کے نظم و نسق کو احسن طریق سے چلانے کا اہل نہیں تو

اپنے ساتھ ساتھ پوری قوم کو بد قسمتی کی دلدل میں دھکیل دے گا۔
اس وقت ارضِ پاکستان پوری دنیا میں بد قسمت ممالک کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے۔ہمارے سیاست دان اس لیے بد قسمت ہیں کہ باوجود اس کے ،کے وہ ہر بار اس دعویٰ کے ساتھ الیکٹ ہوتے ہیں کے ان کے پاس عوام کے تمام مسائل کا حل ہے مگر جیسے ہی اقتدار کی مسہری پہ جلوہ افروز ہوتے ہیں تو وہ سابقین کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں ۔اقتدار سے پہلے وہ تمام مسائل کو چند ماہ میں ختم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جوں ہی اقتدار میں آتے ہیں اُن کے پاس صرف ایک ہی بات ہوتی ہے کئی دہائیوں کے مسائل چند مہینوں میں کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ سیلاب آتے ہیں گزر جاتے ہیں،زلزلے آتے ہیں ماضی ہو جاتے ہیں،دھماکے ہوتے ہیں زمیں کو لہو سے دھو جاتے ہیں،ملک ٹوٹتا ہے مگر نئی نسل تو درکنار اس منظر کے عینی شاہدین تک کے ذہنوں سے یہ واقع ماؤف ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے سیاستدانوں کی سیاسی بصیرت غیر ملکی امداد سے آگے تک جانے سے قاصر ہے۔ہمارے محافظ بد قسمت کہ فرض کو پس پشت ڈال کر آج وہ خود غیر محفوظ ہیں۔ ہمارے علماء بد قسمت کہ دین لہو بن کر ان کی رگوں میں دوڑتا ہے مگر اُن کی تقاریر بے تاثیر ہیں۔ہمارے امراء بد قسمت کہ آسائشِ زیست کی ہر شے میسر مگر قلب سکون سے عاری ہیں۔ میرے وطن کے غریب بد قسمت کہ بے سرو سامانی ،افلاس و پستی کے باوجود کسبِ معاش و محنت

کے شعور سے کوسوں دور ہیں۔ میرے وطن کے صنعت کار و تاجر بد قسمت جو ایک کروڑ کا ٹیکس چوری کرتے ہیں مگر چار کروڑ کا ہر سال بھتہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ میرے وطن کے طالب علم بد قسمت کہ جو علم و ہنر کے راز سے بے خبر فقط طالب وظیفہ و سرکاری ملازمت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جج بد قسمت کہ اُن کے کسی بھی حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔ ہر وہ نو مولود جو اس ارضِ وطن پہ آچکا یا آنے والا ہے بد قسمت کہ پیدا ہوتے ہی مقروض ہو جائے گا۔ پوری قوم بد قسمت یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس ارضِ پاک پہ مائیں بیٹے پیدا کرتی رہیں گی، یہ جانتے ہوئے کہ اس جہاں کے بعد بھی اک جہاں ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے اُن کی زندگیاں جنت کے بدلے خرید لیں ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر فرد قوم کے مقدر کا ستارا ہوتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسلم کے دل میں اللہ کے خوف کے علاوہ کسی کا ڈر نہیں ہوتا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسلم اُمت کا ہر فرد سپاہی ہوتا ہے، پھر بھی پورے اسلامی ملک کو چند انسان نما جانوروں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ اس سے بڑی بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے؟ کہ اس گھر کا ایک ایک فرد کٹ کٹ کے گر رہا ہے۔ مگر پھر بھی ہماری صفوں میں اتحاد و اتفاق نہیں، یہ ہی وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے ہماری خوش قسمتی شروع ہوتی ہے۔ ہمیں ذات، رنگ، نسل کے بتوں کو توڑ کر اُمت محمد ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہونا ہے۔

ہمیں کوئی نیا خواب نہیں دیکھنا، ہمیں کوئی نیا پاکستان نہیں بنانا ہمیں اپنا وطن اپنا وہی

پاکستان بچانا ہے۔ جو ہمارے اجداد نے کا لاکھوں جانوں اور لاکھوں دکھوں کے جھلنے کے بعد حاصل کیا۔ ہمیں حضورﷺ کے فرمان کو سینے سے لگانا ہے۔ کہ مسلمان جسم واحد کی طرح ہے، ایک کا درد پورے جسم کا درد ہے۔ اگر یہ بات میری قوم کے کسی ایک بھی فرد کی سمجھ میں آ گئی تو میں خوش قسمت ورنہ میں بھی بد قسمت اور میرے لفظ بھی بد قسمت۔

فتح اور شکست

افراد اور قوموں کی زندگیوں میں اکثر ایسے موڑ آتے ہیں جب ان کو ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد بہت سے ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں سے اپنوں کو آگ میں جلتا اور خون میں لت پت دیکھتے ہیں۔ بہت سے پیاروں کے ہاتھ ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ جن کے نام اور پہچان زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ پل بھر میں ان کے نام اور ان سے وابستہ رشتے یاد کی سلگتی اگربتی بن کر دل کی فضا کو غم آلود کرتی رہتی ہے۔ ذہن اور جسم دل سے بغاوت کر جاتے ہیں۔ اسی ماحول میں پھر ہمیں ایک اور فیصلہ کرنا ہوتا، ایک ایسا فیصلہ جس پر ہماری آنے والی نسل کو فخر ہو۔ ایک ایسا فیصلہ جس میں ہماری بقا جاوداں ہو۔ یعنی ہمیں فتح و شکست کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ فتح یا شکست، کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ میدان کارزار میں نہیں ہوتا اس کا فیصلہ ہمارے اندر ہوتا ہے۔ Ernest Hemingway's ایک امریکی مصنف اپنے ایک ناول میں بڑا مردامی خیز راز افشاں کرتا ہے کہ ایک آدمی تباہ تو ہو سکتا ہے مگر اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔ یعنی اگر انسان حق شناس ہو جائے اور پھر وہ اس پہ ڈٹ جائے تو خواہ اس کا وجود ریزہ ریزہ کر بھی دیا

جائے تب بھی اُس کے مشن ، مقصد، یقین ، عقیدہ کو مٹایا نہیں جا سکتا۔جب کبھی کوئی باطل قوت کسی حق شناس کے وجود کو مٹا بھی دیتی ہے تواُس کو پھر بھی اس زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ اُس نے حق کو مٹا دیا اُس نے تو صرف یہ کیا کہ جس چیز پہ سورج کی روشنی پڑ رہی تھی ،اس نے اُس چیز کو وہاں سے ہٹا دیا اور ظاہر ہے۔اب روشنی پیچھے جو چیز موجود تھی اُس پر پڑے گی۔قرآن پاک میں اس (Successor)اس کے بات کو بڑے خوبصورت مکالمہ کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔''اے مومنو! اگر یہ رسول د نیا سے رخصت ہو جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم حق بات سے پھر جاؤگے اور اگر ایسا کروگے تو اللہ کا کچھ نقصان نہ کروگے۔''

قارئین کرام دراصل میں اپنی نحیف کوشش سے آپ کے ذہنوں کو اس فیصلے کے لیے تیار کر رہا تھا کہ بحثیت ایک قوم کے اور بحثیت ایک فرد کے اب ہم کو ایک فیصلہ کرنا ہے کہ ہم حق کے ساتھ ہیں یا باطل کے ساتھ ۔ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اصل دین کس کے پاس ہے ؟اب کسی ایک کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے۔یعنی فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔کون شہید ہے اور کون مردود؟کیا کوئی تیسری قوت تو ہمیں یرغمال نہیں بنا رہی؟ یہ معصوم بچوں کا قتل عام یہ راہ گیروں اور مسافروں کا قتل، یہ مسلک کے نام پہ قتل و غارت گری ۔یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے یا ہماری آزمائش؟کیا طالبان میں کوئی غدار پیدا نہیں ہوتا؟کیا

طالبان میں کوئی رشوت نہیں لے گا؟ کیا طالبان عدل کے ترازو میں جھکاؤ نہیں آنے دیں گے؟ حضور ﷺ اور ان کے اصحابؓ نے کتنے کلمہ گو مسلمانوں کے پر خچے اڑائے۔کتنے بے نمازیوں کو سرعام کوڑے لگائے گے۔ کتنی عورتوں کے منہ پہ تیزاب پھینکا گیا۔ کتنی عورتوں کے گھروں پہ پابندی لگائی گئی؟ کیا کسی کے پاس ان کے اعداد و شمار ہیں؟ اگر لکھنا پڑھنا جرم ہے تو کیوں حضور ﷺ نے غیر مسلموں کو کہا کہ اگر وہ جزیہ نہیں دے سکتے تو مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سیکھا دیں۔پاکستان کا وہ کونسا سکول ہے جہاں اسلام کے خلاف تعلیم دی جاتی ہے؟ پھر ان کو کس جرم کی سزا ملی کے بموں سے اڑا دیا گیا۔ اگر ہم عربی میں قرآن سیکھیں تو امریکہ ہمارے مدرسے تباہ کر دیتا ہے۔اور اگر ہم اردو،انگریزی میں قرآن سیکھیں تو طالبان ہمارے سکول تباہ کر دیتے ہیں۔ ہم سکولوں میں محفوظ نہیں۔ہم مدرسوں میں بھی محفوظ نہیں۔ہم عبادت گاہوں میں محفوظ نہیں۔ہم سیر گاہوں میں محفوظ نہیں۔جب سے ملک معرض وجود میں آیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک میری سمجھ میں تو یہ ہی آیا ہے کہ اس کو صرف اسی چیز، کی سزا ملی ہے کہ ہم نے یہ ملک الگ کیا تو کیا کیوں۔ کبھی بنگالیوں کو اکسا کر کبھی کشمیروں کو ستا کر کبھی افغانستان کو ورغلا کر کبھی بلوچوں کو بہکا کر کبھی طالبان کا ڈرمہ رچا کر اور کبھی امریکہ کے اشاروں پہ نچا کر۔اس ملک کے باسیوں کو صرف اور صرف ستایا ہی گیا ہے۔ان کی آنے والی نسلوں کو اس حد تک ایک دوسرے سے بیزار کر دیا جائے کہ بنگالی

بنگلہ دیش بنالیں، بلوچی بلوچستان، سندھی سندھ،پٹھان پختونستان، پنجابی پنجابستان، کشمیری کشمیر ستان۔اس کے بعد ایک اور تقسیم شروع ہو گی، مہاجر، براہوی، مکرانی، سرائیکی، ہزارہ، پھر اس کے بعد ایک اور تقسیم ہو گی شیعہ، سنی، دیوبندی، وہابی اور جانے کیا۔ پھر نہ بھارت کو قبضہ کی زحمت کرنا پڑے گی، اور امریکہ کو یہ سب ٹکڑیاں بھارت اور امریکہ کے محتاج ہوں، بھارت سندھ اور مکران سے مچھلی خریدے گا اور پنجاب اور سرحد کو کمیشن لے بیچ دے گا۔ جیسے مشرقی پنجاب کے ٹماٹر، پیاز، ادرک مغربی پنجاب کو ملتا ہے۔اسی طرح گیس بلوچستان سے لے کر پنجاب کو دے گا اور پنجاب سے گندم بلوچستان کو ملے۔اور سب غلام در غلام چلتے رہیں گے۔یہ معجزات کے قصے سنتے او سناتے رہیں گے مگر شاید پھر ان کو سر سید، قائد اعظم ،لیاقت علی، سردار عبدالرب نشتر، قاضی محمد عیسیٰ، سر سعداللہ، مولوی اے کے فضل حق اورعلامہ اقبال جیسے لیڈر نہ میسر آ سکیں جو پھر ان کا اقبال بلند کر سکیں۔کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اصول ہے کہ خدا ناشکروں پہ اپنی عنائت بار بار نہیں کرتا۔فیصلہ آپ کا ہو گا۔

اس وطن کی بقاکے لیے اس ضعیف کوشش کے ساتھ اپنے بزرگ احمد ندیم قاسمی کے دعائیہ اشعار کے ساتھ دعا گو ہوں

خدا کرے کے میری ارض پاک پہ اترے

وہ فصلِ گل (اتحاد) جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

ہمارے مسائل اور اُن کا حل

ابن آدم کے جسدِ خاکی میں جب روح پھونکی جاتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی مسائل کا لا تعداد سلسلہ درپیش ہوتا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا مرکز ایک ہی ہے اور وہ ہے زندگی کی بقاء انسان کی یہ ازلی خصلت ہے کہ وہ اپنے طرزِ زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا وہ ایک طرف تو زندگی کو دوام دینا چاہتا ہے تو دوسری طرف زیادہ سے زیادہ پُر تعیش رکھنا چاہتا ہے۔ بس یہ ہی سارے مسائل کی وجہ اور اس پہ ہی سارے وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کے لئے لوگوں کی چار اقسام ہیں۔

پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو اپنے تمام مسائل کو ایک گٹھڑی میں باندھتے ہیں اور دوسروں کے سر پہ رکھ کے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ یہ کبھی مسائل کو حل کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔ یہ صرف اُس سہولت سے فیض یاب ہونا جانتے ہیں جو اُن کو پلیٹ میں پڑی ہوئی ملے۔ اگر دنیا میں صرف اس ایک ہی قسم کے لوگ ہوتے تو ابنِ آدم کے ہمسائے آج بھی بندر ہوتے۔ یہ گاڑی، پیپر، قلم، کپڑے، جوتے، گھر، واش روم، تفریح، دعوت، یہ تمام چیزیں دوسروں کی استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مجبوراً نہیں عادتاً استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی کبھی پرواہ نہیں

کرتے کہ جن کا کھانا وہ کھا گئے ہیں دوسروں کو اُس کی کتنی ضرورت ہو گی۔ وہ اس بات کی بھی قطعی پرواہ نہیں کرتے کہ اُن کے اس اقدام سے دوسروں کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ وہ دوسروں کے احساسات کو محسوس کرنا بھی بوجھ سمجھتے ہیں۔ یہ ہی وہ لوگ ہیں جب دوسروں سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں تو پھر جرائم کی راہ اختیار کر تے ہیں اور گری سے گری حرکت بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے اُن کا ڈھیر لگاتے جاتے ہیں،جب یہ مسائل انبار کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کفِ افسوس ملنے لگتے ہیں۔ یہ دوسروں کو اپنی موجودہ حالت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، کبھی اپنے اجداد کو کوستے ہیں تو کبھی معاشرے یا حاکمِ وقت کو بد دعائیں دیتے ہیں۔ یا پھر (اللہ) حاکمِ اعلیٰ سے شکوہ شکا یت کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب ہر طرف سے زچ ہو جاتے ہیں تو یا تو یہ لوگ خودکُشی کر تے ہیں یا پھر ایسے لوگوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں جو ان سے ان کی زندگیاں چند دنوں کی خوشی کے عوض خرید لیتے ہیں

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے دوسروں کو استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ مہذب اور غیر مہذب طریقے

سے وسائل سے فیض یاب ہونا ہوتا ہے لہٰذا یہ لوگ گروہ ،جماعت، گینگ، سوسا

بناتے ہیں۔NGO's، ئٹیاں

یہ لوگ صدقہ ، خیرت ،زکوۃ، فطرانہ یہاں تک کہ انسان تک کو کھا جاتے ہیں۔

چوتھی اور آخری قسم اُن لوگوں کی ہے جو ان تینوں قسم کے لوگوں کے اعمال کو فیس کر تے ہیں۔ یہ لوگ دن رات نوع بشر کے راستے کے کانٹوں کو چنُتے رہتے ہیں، یہ لوگ عمر بھر کی مشقت سے چور چور ہو جاتے ہیں ان کے دامن تار تار ہوتے ہیں اور ہاتھ لہو لہو۔ یہ مسائل کے اژدھا کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ لوگ دریاؤں کا رخ اور پہاڑوں کی ہیت بدل دیتے ہیں۔ یہ اندھوں کو آنکھیں اور معذوروں کو سہارے دیتے ہیں۔ یہ بھوکوں کو نوالہ اور بے آسروں کا آسرا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خوف میں ہمت اور دکھ میں ڈھارس ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کے عیب نہیں ٹٹولتے ۔ یہ لوگ بدنامیاں نہیں بانٹتے۔ بشر ہونے کے ناطے چند غلطیاں ان سے بھی ہو سکتی ہیں مگر ان کی غلطیاں اتنی ھمبگیر نہیں ہوتیں کہ باعثِ سوزِ انسانیت ہوں۔ یہ غلطیاں ان کی نیک سیرت و خصلت میں معدوم ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگیاں لیبارٹریوں، ریسرچ سینٹروں، تعلیمی اداروں، صحافت کے ایوانوں، سیاست کے میدانوں ، سرحدوں،کارخانوں، ہپتالوں غرض کہ ہر وہ جگہ جہاں زندگی سانس لے رہی ہے ان ہی کے دم خم سے ہے۔ یہ بات درست

ہے کہ ان کی تعداد قلیل ہے ۔اسی وجہ سے حضرتِ انسان پریشاں ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان کی تعداد میں کیسے اضافہ کیا جائے ؟اس کا صرف واحد ایک ہی حل ہے اور وہ ہے تعلیم ۔ہمیں نئی نسل کو لفظ نہیں یاد کروانے نہ ہی ہمیں سالوں کی گنتی پوری کرنا ہے۔ہمیں اپنا تعلیمی نظام اس طرح ترتیب دینا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فرد کو دوبارہ تعلیم نہ حاصل کرنا پڑے ۔ہمیں ''ایمانداری بہترین حکمت عملی ہے۔'' پڑھانی نہیں سکھانی ہے کہ بچے دوسروں کی چیز کو اپنی چیز نہ کہہ کرلیں۔ہمیں ''اتفاق میں برکت ہے۔'' بھی نہیں پڑھانی ہمیں یہ بھی اس طرح سکھانی ہے کہ شیعہ سنی، پنجابی، بلوچی ، کی لڑائی ختم ہو جائے۔ہمیں اسلامیات اس طرح پڑھانی ہے کہ، مدرسے اور سکول کا فرق ختم ہو جائے ۔یعنی ہمیں تعلیم اس طرح دینی ہے کہ دنیا اور آخرت کی تعلیم کا فرق مٹ جائے ۔اس ملک کو اس دنیا کو کامیاب طالب علموں کی نہیں کامیاب لوگوں کی ضرورت ہے۔اس ملک اور دنیا کو زیادہ لفظ یا چیزوں کے نام یاد کر نے والوں کی نہیں بلکہ لفظ اور چیزوں کو تخلیق کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ہر سال لاکھوں طالب علم A.B گریڈ میں پر موٹ ہوتے ہیں مگر آج بھی ملک کو ہر شعبے میں اچھے افراد درکار ہیں۔ہمیں ایسا تعلیمی نظام ترتیب دینا ہے جو ہمیں خود انحصاری اور ضمیر کی آزادی سے ہمکنار کرے ۔تاکہ پھر کوئی اسلام کو یرغمال بنا کر غاروں میں نہ لے جا سکے۔

پیغام

حضرت آدمؑ اللہ کی حدود کی پاسداری نہ رکھ سکے اور اُن کو جو کام کرنے سے منع کیا گیا تھا آپؑ سے وہی کام سرزد ہو گیا۔ ''غلطی کرنا انسان کا کام اور معاف کرنا رحمان کا کام '' یہ محاورہ بھی اُسی دن وجود میں آ گیا جب رحمان نے انسان کے پہلے گناہ کو معاف کیا۔ حضرت آدمؑ جب اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں ناکام ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اور اولادِ آدمؑ کو ایک اور آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ایک دلچسپ پہلو کی وضاحت ساتھ ہی کرنا مناسب خیال کروں گا کہ ازل سے لے کر اب تک اور اس کے بعد بھی میرے اعتقاد کے مطابق اللہ کی رحمت ہمیشہ آدمؑ اور اولادِ آدم کے ساتھ رہی اور رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدمؑ کو زمین پر اُتر جانے کا حکم دیا تو اُس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ میری ہدایت (پیغام) تم تک آئے گی تو جو کوئی میری ہدایت
(رہنمائی، پیغام) پائے اُس پر لازم ہے کہ وہ اُس کی پیروی کرے تو جو کوئی پیروی کرے گا اُسے کوئی رنج و غم نہ ہو گا۔ میں یہاں ایک اور بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ دیگر اہل کتاب کی طرح مسلمانوں کی بھی ایک کثیر تعداد کا یہی عقیدہ ہے کہ آدمؑ کو جنت سے غلطی کی پاداش میں سزا کے طور پر زمین پر بھیجا گیا۔ یہ عقیدہ سراسر غلط اور من گھڑت ہے۔ یہ اللہ کی

شان اور فرمان دونوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ جزا کے لیے جنت، سزا کے لیے دوزخ اور آزمائش کے لیے زمین (دنیا) ہے۔ایک آزمائش میں ناکامی کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ایک دوسری آزمائش ڈالا تاکہ دیکھا جائے اور دیکھا یا جائے کہ گناہوں کے داغ ندامت وانکساری کے آنسوں سے ہی دھولتے ہیں۔ میری نظروں کے سامنے ایسے مفسرین کی تحریریں بھی گزریں ہیں جنھوں نے قصہ آدمؑ کو ایک تمثیلی قصہ کہا ہے جس کا مقصد آسان اور عام فہم انداز میں انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور ابلیس کے شر سے محفوظ رہنے اور خطا کے بعد توبہ کی اہمیت سمجھانا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع اور الگ بحث ہے۔ وہ ہدایت جس کا ذکر سورۃ البقرا کی آیات نمبر ۳۸ میں ہے، اس ہدایت کا سلسلہ آدمؑ سے شروع ہوا۔اس ہدایت ربانی کی دو اقسام ہیں ،ایک مبہم (غیر واضح)اور دوسری غیر مبہم (واضح)۔ غیر مبہم وحی (پیغام) اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کے ذریعے نوع انسانی تک پہنچاتا رہا اور اللہ کے یہ نیک (پیغمبر) بندے ہو بہو یہ پیغام عام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ یہ پیغام صحیفوں کی شکل میں آیا، یہ پیغام زبور، تورات، انجیل اور آخر میں ان تمام پیغامات کا انسا ئیکلوپیڈیا قرآنِ پاک کی شکل میں ہم تک پہنچا۔ جوں جوں انسان شعور وارتقا کی منزلیں طے کرتا گیا، توں توں پیغام الٰہی بھی بلیغ و فصیح ہوتا گیا۔ قرآن کی تکمیل کے ساتھ ہی غیر مبہم وحی (پیغام) کو ختمی ہونا تھا، جس طرح یہ پیغام لاثانی و بے مثال تھا، اسی طرح اس کو موثر انداز میں نوع بشر تک اس انداز سے پہنچانا

مقصود تھا کہ یہ انسانیت کے جینز میں کوڈ کی حیثیت سے نقش ہو کر رہ جائے۔اللہ تعالیٰ نے جس پیغمبر کا انتخاب کیا وہ بھی اس کلام کی طرح چلتا پھرتا معجزہ ہے۔جس طرح سارے علوم سمٹ کر قرآن مجید میں آ گئے اسی طرح سارے اخلاق سمٹ کر دامنِ مصطفٰے ﷺ میں آ گئے۔آج بھی قرآن پاک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس جیسی کتاب کوئی بشر نہ لکھ سکا اور محمد ﷺ جیسا اخلاق کوئی پیش نہ کر سکا۔قرآن پاک کی ہدایت کو رد یا نامکمل کہہ کر مزید ہدایت کی طلب یا تلاش ایسی ہی سعی ہے جیسے ، کسی زندہ شخص کو قتل کر کے دوبارہ زندہ کرنے کی ناکام کوشش کرنا۔ میرا ایمان ہے کہ تکمیل قرآن و دین اسلام کے بعد اب واضح ہدایت کی مزید کوئی گُنجائش نہیں ،ہاں البتہ انسانی خصلت میں جو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کا جو مادہ رکھا ہے اُس کو مسلسل یاددہانی کی ضرورت ہے ،اوراللہ نے وہ ضرورت مبہم وحی کے ذریعے پوری کر دی۔ مبہم وحی در حقیقت اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے جو وہ انسانوں تک ہر روز پہنچاتا رہتا ہے۔کچھ لوگ ان اشاروں کو بہت ہی سنجیدگی اور نگاہِ مردِ مومن سے دیکھتے اور سمجھ لیتے ہیں یہ ہی لوگ پھر مفکر و عالم بنتے ہیں ان کی زباں سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اُلجھنوں کو سُلجھاتا چلا جاتا ہے۔بغیر سوال کیے ہی اُن سوالوں کے جواب ملنے لگتے ہیں جن کے جوابوں کی تلاش انسان کے شب و روز کے قرار کو دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہے۔کچھ لوگ ان اشاروں سے سہم جاتے ہیں ،اور دنیا جہاں کی لذتوں کو خیر باد کہہ کر جنگلوں اور ویرانوں میں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں ۔کچھ لوگ ان اشاروں

کی تاب نہیں لا سکتے اور بہک جاتے ہیں، وہ خود کو نبی اور رسول سمجھنے اور کہنے لگتے ہیں ۔یہ بد قسمت خود تو جہنم کا ایندھن بنتے ہیں ساتھ دوسروں کو بھی راہی جہنم کرتے ہیں۔لوگوں کی ایک کثیر تعداد اِن پیغامات کو آئی گئی کر دیتی ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ ایسا کوئی کاروبار نہیں جس سے رقم ایک ہفتے میں بغیر کسی مشقت کے گھر بیٹھے ڈبل ہو جائے مگر اس کے باوجود ہم ڈبل شاہ کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ۔اس فراڈ کے بعد بھی ہمیں کسی نہ کسی صورت میں کسی ڈبل شاہ کی تلاش رہتی ہے۔تیز رفتاری اور لاپر واہی سے ہم جان لیو حادثے سے بال بال بچتے ہیں مگر پھر بھی ہم احتیاط نہیں کرتے ۔ہمیں بُرے اور ڈراؤنے خواب آتے ہیں مگر ہم راہ راست کی طرف نہیں لوٹتے۔ہم ہر روز کسی نہ کسی مصیبت اور پریشانی میں رہتے ہیں مگر اپنے اعمال اور کوتاہیوں کی درستگی نہیں کرتے بلکہ یہ کہہ کر آگے چل پڑتے ہیں کہ مصیبتیں اور سختیاں اللہ کے نیک بندوں پر آتی رہتی ہیں ۔ہم رزق کی تنگی کا رونا روتے ہیں مگر اپنے گھر کی چھت کے نیچے ہونے والی نا انصافی کا سدِباب نہیں کرتے۔اچھے لوگ ایک ایک کرکے ہم سے کنارہ کش ہوتے جاتے ہیں اور اس کی جگہ چاپلوس اور منافق ہمارے گرد گھیرا تنگ کر تے جاتے ہیں مگر ہم قدرت کے اس پیغام کو پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں ۔بات بیٹیوں کے رشتوں کی ہو،کاروبار کی ہو، گھر میں بے سکونی وخانہ جنگی کی ہو،اولاد کی نافرمانی کی ہو،کُند ذہنی کی ہو،بیماری کی ہو، ہم ان تمام مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں ۔یہ

دوسرے کسی بھی روپ میں ہو سکتے ہیں۔ در حقیقت اللہ تعالیٰ ہمیں غفلت کی نیند سے بیدار کرنا چاہتا ہے مگر ہم روز بروز گمراہی کی اتھاہ گہرائی میں گرتے جاتے ہیں۔ ہم کالے اور سفید جادو کرنے والوں کے ہتھے چڑھ کر مزید زندگی اجیرن کر لیتے ہیں۔ دنیا میں جتنی بھی آسائشیں آئیں ہیں وہ سب غریب مفلس، محکوم اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ بس انہوں نے اللہ کے اشارے (پیغام) کو سمجھ لیا اور سنبھل گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اشاروں (پیغام) کو سمجھ کر راہ راست کی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

زندگی کے دکھوں سے بے حال تھے
جو غور کیا تو اپنے ہی اعمال تھے

احتجاج شاپ

ہمارے ہاں ہر قسم کے احتجاج کا سامان کرایہ پر دستیاب ہے۔اگر کوئی بچہ گٹر میں گر کر اس دارے فانی سے کوچ کر گیا ہے تو 12 سے 25 سال کے لڑکے ،40 سے 60 سال تک کی خواتین احتجاج کے لیے دستیاب ہیں ۔نیز بسوں پر پتھراؤ کرنے کے لیے اعلیٰ اور مضبوط اینٹ پتھر بھی دستیاب ہے ،کار وغیرہ کو جلانے کے لیے پٹرول نہائیت سستے ریٹ پر دستیاب ہے۔قرآن پاک کی بے حرمتی ہو یا رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی ،جلاؤ گھیراؤ کرنے کے لیے باریش اور فربہ افراد کرایہ پر دستیاب ہیں ،روڈ ڈلیوری فری پیکج کے ساتھ ۔حج ،عمرہ کرپشن کے احتجاج کے لیے بھی باریش افراد کی ورائٹی موجود ہے۔اگر کسی بیٹی ،بہن کی عزت داغدار کر دی گئی ہے توNGO's کے لیے اپنا نام روشن کرنے کا سنہرا موقعہ ،میک اپڈ خواتین بینر فری سروس کے ساتھ دستیاب ہیں۔بجلی بحران کے احتجاج کے لیے ڈنڈا بردار نوجوان مناسب کرایہ پر دستیاب ہیں، جو کہ قومی املاک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کا تجربہ رکھتے ہیں ۔سیاسی احتجاج ،لانگ و شارٹ مارچ کے لیے تھوک و پرچون ریٹ پر افراد دستیاب ہیں ذلیل و خوار ہونے کے 20 سالہ تجربے کے ساتھ ۔اشتعال و شر انگیز تقاریر ،منافرت وفرقہ وارانہ فساد پیدا کرنے کے لیے جید علماء کرام کی ہر طرح کی ورائٹی

دستیاب ہے۔ لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے احتجاج کرنے کے لیے لگژری گاڑیاں ،اور اعلیٰ سوسائٹی کے مرد وخواتین بچے فری سروس کے ساتھ دستیاب ہیں ۔ جیو دھماکہ آفر، سیاسی پارٹیوں کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ کے ساتھ احتجاج کار ''بائے ون گٹ ون'' فری سروس کے ساتھ موجود ہیں ۔اپنا آڈر ابھی بک کروائیں سٹاک محدود ہے۔امریکہ کے خلاف احتجاج کی مکمل ورائٹی موجود ہے۔پاکستانی بسوں کی توڑ پھوڑ کے لیے پتھر، مسافروں ،راہ گیروں کو پریشان وذلیل کرنے کی مکمل ورائٹی موجود ہے نیز سڑک بلاک کرنے ،اور ماحول میں زہریلا دھواں بھرنے کے لیے انتہائی ناقص ٹائر موجود ہیں ۔عمران وطاہر فارمولا کو کامیاب بنانے کے لیے فریش مقامی وغیر مقامی افراد دستیاب ہیں ۔عمران وڈاکٹر طاہر القادری کی آنکھ کا تارا بننے کا سنہری موقعہ ، کہیں دیر نہ ہو جائے ؟ تنومند اور ویل ڈریس پرسن مناسب کرایہ پر دستیاب ہیں۔یاد رکھیں پاکستان کے علاوہ ہماری اور کوئی برانچ نہیں ۔نقالوں سے ہوشیار، ''بے وقوف عوام نام لے کر طلب کریں ۔آپکی صرف ایک کال پر'' وہلی وبے عمل'' قوم حاضر خد'' مت ہے۔

شعبہ ہیلتھ کے خلاف احتجاج کے لیے ہر عمر کے ڈنگر ڈاکٹر وڈاکٹر دستیاب ہیں نیز ہر عمر کی نرسیں بھی دستیاب ہیں ۔وکلاء احتجاج کے لیے بلیک کوٹ فری سروس دستیاب ہے۔تاجر برادری کے احتجاج کے لیے فربہ وسفید پوش احتجاج کار

فی گھنٹہ کے حساب سے میسر ہیں۔ کمپنی کی مشہوری کے لیے کچھ نعرے فری ٹرائل کے ساتھ حاضر ہیں۔

ملک کی اینٹ سے اینٹ بجائیں گے
اپنی پارٹی ہر صورت بچائیں گے
عوام مرتی ہے تو مرنے دو
امریکہ کو اپنا کام کرنے دو
عقل و ہنر سے ہرگز کام نہ فرمانا
سکالرشپ،انکم سپورٹ اور امداد کھانا
مانگ کے کھاؤ،چوری کا کھاؤ
مگر جناب یہ کیا؟ کما کر تو نہ کھاؤ

نوٹ: ہمارے اس اشتہار کے خلاف تمام ملک سے احتجاج کار درکار ہیں، نیز دھمکیوں ہر وقت فری سروس کے ساتھ کھلا ہے۔ مجھے آپ کی E-mail اور گالیوں کے لیے میرا تنقید کا شدت سے انتظار رہے گا۔اب آپ کی خدمت بہتر انداز میں

آپ کا مخلص

اے۔آر۔اخلاص

انسان نے جہاں ترقی کے بے شمار محاذ فتح کیے وہاں آج بھی بہت سے ایسے سربستہ راز ہیں جو اُسے بے قرار رکھے ہوئے ہیں۔ان میں سے سب سے مایوس کُن اور غم ناک کر دینے والا سوال یہ ہے کہ موت کے بعد میرا کیا ہوگا؟ کیا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے ؟ اگر ہے تو اُس کی کیا حقیقت ہے ؟اُس زندگی میں کامیابی وناکامی کے اسباب کیا ہیں ؟ یہ سوال ہر انسان کے ذہن میں اسی طرح موجود ہے جس طرح زندہ رہنے کی حس۔ہر مذہب نے اپنے پیروکاروں کو مطمئن کرنے اور اس دنیا کی زندگی میں توازن پیدا کرنے کے لیے آخرت (زندگی مابعد زندگی)کا تصور پیش کیا۔ان تمام مذاہب میں جو قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ تمام مذاہب نے یہ شرط عائد کی کہ آخرت کی زندگی میں خوشحالی صرف اُس کو نصیب ہو گی جو اس دنیا میں اچھے (انسانی بہبود کے) کام کرے گا۔مگر جو اعمال بد (انسان کش جرائم) کا ارتکاب کرے گا اُس کی آئندہ کی زندگی ہمیشہ کے لیے ذلت و رسوائی کا بوجھ بنادی جائے گی۔مگر بد قسمتی سے جب مذہب کو چڑھاوے ،خدمت ،توفیق، نظرانوں، منتوں ،چادروں ،نیازوں کی صورت میں رشوت ملنے لگی تو یہ جنت بھی فقط رؤسا کی ملکیت ہو کر رہ گئی۔غُربا تو پریشان تھے ہی مگر یہ بے چینی اُس وقت بامِ عروج پر

پہنچی جب ردِ مذہب کی ہوا چلی ۔جب کسی قوم کے مذہب کو رد کیا گیا تو اُس کے ساتھ ہی اُس کے تمام اچھے اعمال پر باطل اور شیطانی اعمال کا لیبل لگا کر رد کر دیا گیا۔جب سماجوں اور تہذیبوں نے اس ظالم اور انسان دشمن فلسفے کو مذہب کی آغوش میں پروان چڑھانا شروع کیا تو پھر انسان کی قدر اُن چیزوں سے بھی کم تر ہو گئی جو کبھی انسان کا صدقہ اُتار کر پھینک دی جاتیں تھیں ۔آج صورت حال یہ ہے کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں امن کے لیے ضروری ہے کہ ہر غیر یہودی کو قتل کر دیا جائے ۔اہل کلیسا اس پوری دنیا کے انسانوں کو عیسائیت میں ضم کرنے کا خواب سجائے ہوئے ہے۔برہمن کا اعلان ہے ۔مکتی صرف ہندو ہونے اور ہندو کرنے میں ہے ۔مسلم کہتے ہیں سب اہل کفار واجب القتل ہیں ۔تو اہل طائف ،اہل قریش ،اور اپنے عزیز و اقارب کے قاتلوں کو معاف کر دینے کا ہادی برحق ﷺ کا فلسفہ (سنت) کیا ہوا؟آج تو ہم مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم سے راہ راست پر کون ہے؟ ہم میں مومن کون ہے؟کون حق شناس ہے اور کون گمراہ ہے ؟ہم دوسرے مذاہب کو مشرک کہہ کر قتل کرتے جا رہے ہیں کیا ہم موحد ہیں ؟بس فرق اتنا ہے کہ جن کو ہم مشرک کہتے ہیں طلوع اسلام سے آج تک اُسی عہد کُہن کے شرک میں مبتلا ہیں اور ہم نے وقت کے ساتھ شرک کو ماڈرن کر لیا ہے ۔دولت ،امریکہ،انگلینڈ، صدارت، وزارت، گدی نشینی، سیٹ، حوس، لالچ، خود پسندی ،اقرا پروری، ذات، نسل یہ ہمارے معبود نہیں تو کیا ہیں؟

آج پھر ہمیں وہی سوال درپیش ہے کہ مرنے کے بعد ہمارا کیا ہوگا؟ اگر ہم اپنے مذہب کے ساتھ مخلص ہوتے تو آج ہم اس کشمکش کا شکار نہ ہوتے۔ ہم مولوی صاحب کے منہ سے جنت کی نوید سننے کے لیے بے چین رہتے ہیں ہم اُن کو پڑھے اور پڑھائے جانے والے قرآن، تسبیحات اور ذکر اذکار گن گن کر بتاتے ہیں۔ کب کب اور کہاں کہاں نیک کام کیے وہاں پر تاریخ، لاگت اور اپنے نام کے ایصالِ ثواب کی تختی لگاتے ہیں، کہیں فرشتے غلطی یا کرپشن سے ہمارا ثواب کسی اور کے کھاتے میں نہ لکھ دیں۔ اور اگر ہم نے ایصالِ ثواب کی تختی نہ لگائی تو نیکیوں کے رجسٹر میں ہمارا نام درج ہونے سے نہ رہ جائے۔ کیا ہمیں قرآن کی وہ تعلیم بھول گئی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تمھارے جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون؟ کیا ہمیں قرآن کی وہ آیت بھی بھول گئی کہ تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ خوب خبر رکھنے والا ہے؟

اُوپر بیان کردہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہمیں اللہ کے بندوں سے محبت نہیں، اللہ کی جنت سے محبت نہیں۔ ہم کو یہ وہم کھائے جا رہا ہے کہ بنک میں محفوظ رقم کی طرح ہمارے اعمال بھی محفوظ ہوں اور ہمیں ایک نیکی کے بدلے ہزار نیکی کا (سود) ثواب مل جائے۔ نیک اعمال انسانوں کو بچانے کے لیے تھے نہ کہ انسانوں کو قتل کرکے نیک اعمال بچانا۔

جب ہمیں یہ ہی معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے اور یہ بات پیغمبروں، والیوں، درویشوں، قلندروں، اماموں تک کو معلوم نہیں۔ تو پھر ہم کس حیثیت سے جنت اور دوزخ کے سرٹیفیکیٹ تقسیم کر رہے ہیں؟

ہمیں سب سے پہلے انسان کو انسان کے خوف سے نکالنا ہو گا۔ آج کا انسان ہاتھی اور شیر کے قریب سے بے خوف گزر سکتا ہے۔ مگر ایک آدمی جب اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے تو خالی گلی میں سے تو وہ آرام سے گزر سکتا ہے مگر جب اُس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی کونے میں سے نہ نکل آئے یہ خیال آتے ہی اُس کی جان پر بن جاتی ہے۔ کسی اجنبی شہر میں اجنبی رکشے یا کار میں بیٹھے، باوجود اس کے کہ اُس نے اُس کے ساتھ اُجرت طے کی ہوتی ہے اور یہ کہ وہ اُس کو باحفاظت منزل پر لے جانے کا پابند ہوتا ہے مگر مسافر گاڑی والے سے اور گاڑی والا مسافر سے ڈر رہا ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ دونوں مسلمان ہیں۔ پہلے مسلمان کے دل سے مسلمان کا ڈر نکالو۔ پھر انسانوں کے دل سے مسلمان کا ڈر نکالو۔ اللہ کے وعدے کے مطابق دنیا کے حکمران تم ہی ہو گے اگر مومن ہوئے تو۔ ورنہ خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھودتے رہو گے۔ اغیار سے شکست و ذلت سے دوچار ہوتے رہو گے۔ نیک کام بھی ذہنی سکون میسر نہ کر سکیں گے جب تک اپنی بقا کے دشمن بنے رہو گے، یعنی جب تک انسانوں کے دشمن بنے رہو گے۔

ہم تو عام ہیں

میں قسم کھاتا ہوں میں جھوٹ نہیں بولتا میں سچ میں جینا چاہتا ہوں ۔خدا کے لیے مجھے جینے دیں ۔میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فیض یاب ہونا چاہتا ہوں ۔میں دنیا کے خوبصورت مناظر دیکھنا چاہتا ہوں ۔میں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ دیکھنا چاہتا ہوں ۔میں اپنے وطن کے صحراوں کی صبح کی ٹھنڈک محسوس کرنا چاہتا ہوں ۔میں اپنے خشک ہونٹوں کو وطن کی آبشاروں کے جھرنوں سے تر کرنا چاہتا ہوں ۔قسم سے میں جینا چاہتا ہوں ۔ میں اپنے وطن کے سرسبز و شاداب جنگلوں میں پرندوں کے ترنم میں ڈوب جانا چاہتا ہوں ۔میں اقوامِ عالم میں تن کر چلنا چاہتا ہوں ۔میں فخر سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہاں ! میں پاکستانی ہوں ۔میں بھی دنیا کی سیر و سیاحت کرنا چاہتا ہوں ۔مگر کوئی وزیر مشیر بن کر نہیں ۔میں ایک عام پاکستانی ہوں ۔جس کی جمع عوام ہے ۔میں دراصل پاکستان ہوں ۔میں دہشت گرد نہیں ،دہشت زدہ ہوں ۔قسم سے میں ظالم نہیں ،مظلوم ہوں۔میں حیوان نہیں ،انسان ہوں ۔میں بھکاری نہیں ،ہاں غریب ہوں ۔میں خیرات نہیں مانگتا،مجھے انکم سپورٹ نہیں ،فقط محنت کے لیے پرامن جگہ چاہیے ۔

اے میرے لیڈرو ! اے میری خوشحالی کے لیے چیخ چیخ کر بلٹ پروف گاڑیوں

کنٹینروں اور شیشوں کے پیچھے کھڑے ہو کر تقریریں کرنے والو، قسم سے میں بھی جینا، چاہتا ہوں ۔جو انقلاب صرف میری موت سے آئے مجھے وہ انقلاب نہیں چاہئے ۔مجھے ووٹوں اور جعلی انقلاب سے کیا لینا دینا، مجھے تو اپنے بچوں کے لیے روٹی چاہیے ۔مجھے اپنی بہن کے لیے جہیز کمانا ہے ۔ کسی کارخانے ،دکان و فیکٹری میں کام چاہیے ۔ میں اپنے ہی گھر کو جلا جلا کر تھک گیا ہوں ۔میں اپنے ہی بھائیوں سے دست و گریباں ہو ہو کر تھک گیا ہوں ۔خدا کے لیے ! میری بھلائی کے لیے کام کرنا چھوڑ دو ۔خدا کے لیے ! مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔اے میرے رہنماؤ میری رہنمائی چھوڑ دو۔ میرے درد کا تدارک کرنا ہی چاہتے ہو تو پہلے میرے درد کا ادراک تو کر لو۔کچھ زیادہ نہیں بس میر ے پڑوس میں چند دن قیام کر لو۔اپنے بچوں کو چند دن کسی سرکاری سکول میں داخل کروا کر دیکھو۔فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک دن صرف ایک دن ہر آنے جانے والے کی طرف اس اُمید سے دیکھ لو کہ شاید وہ تمھیں دیہاڑی کے لیے اپنے ساتھ لے جائے ۔میری طرح عام ہو کر میرے خاص دکھوں کا احساس کر کے دیکھو۔ہر روز مجھے روشن کل کی خبر دینے والو۔میں صرف آج کے دن تک کے لیے زندہ ہوں بس میرے آج کو ذرا سا روشن کر دو۔پھر قبرستانوں میں لاکھ چراغاں بھی کروگے تو بھی میری تُربت میں اندھیرا ہی ہو گا۔اپنے کسی عزیز کا سرکاری ہسپتال میں علاج کروا کر تو دیکھو، کس طرح ایک عام شخص قطرہ قطرہ موت کی آغوش میں تھک کر سو جاتا ہے اور عام (میں) کچھ بھی نہیں کر پاتا ۔ایک روز ایسا باپ بن

کر دیکھو جس کی بیٹی بغیر سیکورٹی کے تعلیم حاصل کرتی ہے ،کام پہ جاتی ہے ،اور پھر کسی کی حوس کا شکار ہو جاتی ہے۔یہ میرے عام سے دکھ ہیں اے خاص لوگو !اور اگر میں اور تم ایک ہی ہیں تو پھر میرا اور آپ کا دکھ جُدا جدا کیوں ہے؟

زہر کھا کر ہم ہی کیوں مرتے ہیں ؟ سستے بازار ہمارے لیے کیوں لگتے ہیں ؟ہم عدالتوں میں ہی کیوں قتل ہو جاتے ہیں ؟اگر آپ ہمارے محافظ ہیں تو ہم ہی آپ کی اور آپ کے خاندان کی سیکورٹی پر کیوں مامور ہیں ؟آپ کو تعطیلات ہوتی ہیں مگر ہماری چھٹیاں کیوں منسوخ کر دی جاتی ہیں ؟ہمارا لباس ایک جیسا نہیں ۔ہماری خوراک ایک جیسی نہیں ۔ہمیں ایک جیسی سہولیات حاصل نہیں ۔ہمارے گھر ایک جیسے نہیں ۔ ہمارے دکھ سکھ ایک جیسے نہیں ۔تو پھر میں کس طرح کہوں کہ اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ۔

میرا تو فقط ایک ہی خواب ہے کہ مجھے بھی جینے دیا جائے ۔اگر میں اس وطن کا شہری ہوں تو مجھے میرے حقوق سے محروم نہ کیا جائے ۔مجھے میرے فرائض سے غافل نہ کیا جائے ۔انسان ہوں کسی فرد یا پارٹی کی پراپرٹی نہیں ہوں ۔ کس کس کی موت کا مداوا چیک سے کروگے ؟کس کس بیٹی کی عزت کا بدل فقط چیک ہو گا؟کیا سب دکھوں کا مرہم چیک ہے؟خُدا کے لیے درد بانٹو،چیک نہیں۔

اگر واقعی آپ عوام کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دھرنے، انقلاب، جلوس کے عذاب سے ہماری جان چھوڑیں۔

اپنے اپنے عہدہ اور اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے محنت کریں۔ فقط تنقید اور الزام تراشی سے توبہ کریں اور کوئی ڈھنگ کی بات کریں جسے نہ صرف ہم بلکہ دنیا بھی غور سے سنے۔ پٹاری سے سانپ نکالنے والی سیاست چھوڑ کر خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنائیں۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے، تو خُدا کے لیے اس ملک کی اور ہماری جان چھوڑیں۔ کم از کم یہ احسان ضرور اس قوم پر کریں نہ ہمارا غم آپ کو ہوگا اور نہ آپ کی وجہ سے ہماری زندگی عذاب ہو گی۔ آپ لوگ ہماری جان چھوڑیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ہم پہ رحم فرمائے گا۔ صبر کریں خُدا کے لیے اس حکومت کو اپنا کام کرنے دیں۔ مدت پوری ہونے دیں۔ اگر یہ اہل نہ ہوئے تو عوام خود بخود انہیں مسترد کر دے گی۔ اور آپ کو منتخب کر لے گی۔ عوام مزید آپ کے کھیل میں اپنا وقت اور پیسہ برباد نہیں کرنا چاہتی۔ ملک کی آخری اُمید (فوج) پہلے ہی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی۔ ہمارے پاس اقوامِ عالم میں اپنی عزت بچانے کا یہ آخری اور فیصلہ کن موقع ہے۔ اور اگر اب ہم ہار گئے تو نہ آپ کے ہاتھ کچھ آئے گا اور نہ آپ کے آقاؤں کے ہاتھ کچھ آئیگا۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو عام ہیں۔

پھولوں کے جنازے

سانحہ پشاور رونما ہوا تو ہر نم آنکھ کے ساتھ ہر قلم بھی اشک بار ہوئی۔ سیکیورٹی اداروں پر سوالیہ نشان بھی بنے۔ سکول کی ناقص سیکیورٹی پر بھی بات کی گئی۔ کمیٹیاں بھی بنائی گئیں۔آئیندہ کے لیے ایسی سنگینی سے نمٹنے کے لیے منصوبے بھی تشکیل دیے گئے۔ سیکیورٹی کے نام پر سیکیورٹی اداروں کے اہل کاروں کو ساری ساری رات سردی میں ہائی الرٹ بھی رکھا گیا۔ سیکیورٹی کے اشیو کو زیر بحث لاتے ہوئے تعلیمی اداروں کو فوری معین مدت تک کے لیے بند کر دیا گیا۔ 7،8 آٹھ دہشت گردوں کو دہشت گردوں کے لیے دہشت کی علامت بھی بنایا گیا۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا جو ہم نے یہ پلان ترتیب دیا ہے اس سے واقعی دہشت گردی کا جڑ سے خاتمہ ہو جائے گا؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ میں پہلے اس بات کی وضاحت کر دوں کہ دہشت گردی پروان کیسے چڑھی؟ کیونکہ ہر باشعور شخص اس بات سے باخوبی آگاہ ہے کہ جب تک کسی مسئلہ کے پنپنے کی وجہ معلوم نہ ہو ہم کبھی بھی مسئلہ کا حل پیش نہیں کر سکتے۔ رائی کے چند پتے جھاڑنے سے یا اس کی شاخیں کاٹ دینے سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ہے جب تک ہم اس کو جڑ سے نہیں اکھیڑ

دیتے۔اب ہم اس کے حل کی طرف آتے ہیں۔

نمبر ایک ہم پوری قوم کو پہلے تو یہ تعین کرنا ہو گا کہ حق پر ہم ہیں کہ وہ جو ہمیں اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر قتل کر رہے ہیں۔سکول میں جاتے ہیں تو اسلام کی شکل کچھ اور نظر آتی ہے اور جب نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے مسجد مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو اسلام کا کوئی اور ہی روپ نظر آتا ہے۔جب تک ہم اس کشمکش سے نہیں نکلتے۔اندر والے باہر والوں سے مل کر ہمیں مرواتے رہیں گے۔

نمبر دو جس قوم کے بچوں کو چھپکلی، چوہے، بلی، بھو وغیرہ سے بچپن میں ہی ڈرا ڈرا کر دہشت زدہ کیا جاتا رہا ہو۔جہاں بچیاں اکیلی ایک گلی سے دوسری گلی نہ جا سکتی ہوں۔جہاں بازاروں اور چوراہوں پر اوباش دندناتے ہوں۔جہاں قانون کے محافظوں کے پاس جانے سے لوگ کتراتے ہوں، جہاں سالوں تک قتل، چوری، زنا کے مجرموں کو سزا تو در کنار کئی کئی سال تک مقدمے تک نہ درج ہوتے ہوں۔اس قوم میں معوذؓ معاذؓ، عونؓ و محمدؓ، ام اعمارہؓ، صفیہؓ، زبیرؓ کے جانشیں کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ہم جب تک اپنے بچوں کی تربیت درست سمت میں نہیں کر لیتے، ہم جب تک خود گھروں سے نکل کر گلی محلوں کی دہشت کو شکست نہیں دے لیتے ہم اس دہشت گردی کی جنگ نہیں جیت سکتے

۔ ظلم سے بچنے کا واحد راستہ انصاف کرنا ہے۔جب تک ہم انصاف میں غفلت کرنا نہیں چھوڑ دیتے ،دہشت گردی کے سلیپر سیل پیدا ہوتے رہیں گے۔اور ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ذبحہ ہوتے رہیں گے۔

نمبر تین بچت ہمیشہ برے وقت کے لیے کی جاتی ہے نہ کہ بچت کر کے ،آخر میں ایک ہی دن ساری بچت کھا جانا۔بد قسمتی سے جو بھی حکومت ہمارے ہاں اقتدار میں آتی ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سکورنگ کرے۔تاکہ ایک طرف، وہ اپوزیشن کا منہ بند کرسکے اور دوسری طرف وہ عوام میں مقبول ہو جائے اور بدلی میں ان کے اقتدار کا زمانہ لمبا اور لمبا ہوتا رہے۔ان مقاصد کے حصول کے لیے ،ایک ہی وقت میں بے شمار ترقیاتی اور غیر ترقیاتی منصوبے شروع کر دیے جاتے ہیں۔اتنے سارے منصوبوں کی مانیٹرنگ اور پھر ان کے اخراجات حکومت کے بس کی بات نہیں رہتی ،اور پھر یہ ٹیکس اور وہ ٹیکس عام آدمی سے جائز اور ناجائز کی تمیز چھین لیتا ہے ۔بھوک کا خوف موت کے ڈر کو بھی دل سے نکال دیتا ہے۔اس سے بھی بڑا المیہ یہ کہ وہ سارے منصوبے بھی کرپشن کی نظر ہو جاتے ہیں کیونکہ منتخب نمائندے پہلی اور آخری اینگ سمجھ کر اقتدار کا کھیل کھیل رہے ہوتے ہیں۔90 فیصد نمائندے فقط اقتدار کے لیے الیکشن کی باری لگاتے ہیں نہ کہ عوام کی بہبود کے لیے۔میں الیکشن کے دنوں میں امیدواروں کا جوش و جذبہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں اور سوچتا

ہوں کاش یہ اسی جذبہ سے خدمت خلق کے لیے لڑیں، مگر افسوس یہ تو اقتدار کی جنگ ہو تی ہے۔جتنا بھی ریونیو کی صورت میں یا زکوۃ کی یا سرکاری اداروں کی انکم کی صورت میں قومی دولت جمع ہو تی ہے اگر اس میں سے فقط 30 فیصد بھی عوامی منصوبوں پر لگا دیا جائے تو 70 فیصد دہشت گردی پیدا ہو تے ہی مر جائے۔

آخری بات ، قومی یکجہتی کو ہر ممکن فروغ دیا جائے اگر امن کا نوبل پرائز ہو سکتا ہے تو قومی یکجہتی پر بھی ،یکجہتی پرائز ملنا چاہیے ۔ذات پات ،رنگ ، نسل اور صوبائیت پر ستی کی ہر سطح پر حوصلہ شکنی ہونی چاہے۔اس کے لیے بنیادی سطح پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

بس یہ ہی وہ کام ہیں جن کو کرکے ہم دہشت کے اس عفریت کو شکست دے سکتے ہیں ورنہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہمارا معاشرہ خود شکست و ریخت سے دوچار ہے صرف اس کا واحد علاج درج بالا ہی ہے۔نہ امریکہ ہماری مدد کر سکتا ہے اور نہ ہی سعودی عرب آئے روز امداد دے سکتا ہے ہمیں اپنی بقا کی جنگ خود ہی لڑنا ہے ورنہ ایک ایک کرکے ہم سب زومبی بن جائیں گے اور اپنے ہی اپنوں کو نوچ نوچ کر کھاتے جائیں گے۔جب تک باغبان سب اچھا کی بانسری بجاتے رہیں گے اس گلشن کے پھولوں کے جنازے اٹھتے رہیں گے اور ہر نیا ہونے والا المیہ

پہلے المیہ کو چھوٹا اور چھوٹا کرتا جائے گا۔

قدر

اس آسمان کے نیچے اللہ تعالٰی نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔اور خود اس کا وجود بھی ایسی نعمتوں کا مرقع ہے جس کا بدل کم از کم اس دنیا کی ساری نعمتیں بھی نہیں،اور شاید اسی وجہ سے انسان کو باقی تمام مخلوق پر برتری حاصل ہے۔اللہ تعالٰی نے یہ نظام قدرت ایسا بنایا ہے جو ایک عام آدمی پر بھی ایسے ہی لاگو ہوتا ہے جیسے ایک خاص آدمی پر، اس قانونِ قدرت میں کسی کو بھی رعائت حاصل نہیں۔جس طرح یہ نظامِ کائنات ایک معین مدت کے لیے ہے اسی طرح اس کائنات میں موجود نعمتیں بھی ایک طے شدہ وقت تک کے لیے ہوتی ہیں ۔ہمارا اپنا وجود بھی اس کی ایک مثال ہے۔مگر یہاں ایک دلچسپ بات سے ضرور آپ کو آگاہ کرتا چلوں کہ یہ وعدہ بھی صرف اُن نعمتوں یا اُن کے لیے ہے جو دائرہ قدرت کی پاسداری کرتے ہیں۔جو اس دائرہ قدرت سے نکل گیا ہو اُس کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں۔آپ نے اکثر ایک بے قدر ہُنر مند کو دیکھا ہوگا جو ساری عمر اُس ہُنر سے رزق بھی کماتا ہے اور اُس کے خلاف زہر فشانی بھی کرتا ہے۔اور جب کام کرنے لگتا ہے تو کسی اوزار کے نہ ملنے پر اُس اوزار یا پرزہ کو کوستا بھی ہے اور کیونکہ وہ اپنے فن کی قدر بھی نہیں کرتا پھر کیسے وہ اپنے اوزاروں کی بھی قدر کرے گا اور پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں اچھا کام کرکے دے اور پھر کیسے وہ

اچھا معاوضہ پائے گا اور جب اچھا مُعاوضہ نہیں پائے گا تو کیونکر وہ زندگی کی آسائشوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنے ماں باپ کی قدر نہیں کرتے اور دوسروں کے ماں باپ کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔کچھ تو اُن کو دوسرں کے ماں باپ کی مثالیں اور حوالے دے کر بھی شرمسار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اکثر اس قسم کے فقرے بولتے ہیں" آپ نے ہمارے لیے کیا ہی کیا ہے؟"مگر ہمیں اُن کی اور اُن کی وراثت کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب وہ منوں مٹی کے اندر ہزاروں حسرتوں اور خواہشوں کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔پھر ہماری آنکھوں میں نمی اور اُن کی کمی رہ جاتی ہے اور وہ سارے درد جو ہم نے اُن کو دیئے ہوتے ہیں ہمارے دل کی زمین پر اُگنے لگتے ہیں۔میں نے ایسے ماں باپ بھی دیکھے ہیں جو اولاد کی قدر نہیں کرتے وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو کوستے رہتے ہیں کہ فلاں کا بچہ ایسا ہے اور فلاں کا بچہ ویسا ہے۔"اور تم کیا ہو فقط دکھ اور تکلیف" مگر پھر وہی بچہ ہوتا ہے، جو آپ کے بوڑھے جسم کو اپنے جوان ہاتھوں میں اُٹھائے پھرتا ہے۔سخت بارش میں بھی اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے اُس کی آنکھیں آپ کے درد میں پرنم ہیں۔کیا ہم بھول جاتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی وجود کا ایک حصہ لے کر پیدا ہوا ہے؟مگر ہمیں اپنی اولاد کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب ہم اُن کو اپنے گھر سے بے دخل کر دیتے ہیں۔وہ اولاد جس کا ہم چہرہ دیکھنا یا پھر جس کا نام تک سننا گوارہ نہیں کرتے وہ ساری زندگی اپنے نام کے ساتھ ہمارا نام

لکھ کر ہمیں زندہ رکھتا ہے۔جب ایک شخص اپنے بچوں کی ذہانت سے خوش نہیں ہوتا جب ایک شخص اپنے پیشہ سے خوش نہیں ہوتا،جب ایک نوجوان اپنی جوانی کی قدر نہیں، کرتا،جب ایک شخص اپنی صحت کی قدر نہیں کرتا،جب ایک شخص اپنے ماں باپ کی قدر نہیں کرتا،اور جب ہم وفادار لوگوں کو نظر انداز کرکے خوشامدوں پر نظرِ کرم کرنے لگتے ہیں اور جب ہم مظلوموں کو نظر انداز کرکے ظالموں کے ہم نوا بن جاتے ہیں ،اور جب تیز رفتار گاڑی میں اپنے جسم کی قدر کو بھول جاتے ہیں،اور جب ہم اچھے لوگوں کی پیروی کرنا چھوڑ دیتے ہیں،ہم رزق کی قدر کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور تو اور ہم اللہ کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو کر بھی اُس کا شکر نہیں کرتے تب ہاں تب اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا دستر خوان لپیٹ لیتا ہے اور ہم ذلت ورسوائی کے تاریک گھڑے میں عمر بھر ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں۔فرمانِ خداوندی ہے ''میرا شکر کرو میں تمہیں اور دونگا۔'' مگر عجیب بات ہے ہمارا شکر بھی آج منافقت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ہم نے شکر کو فقط تکیہ کلام (ڈائیلگ) بنا لیا ہے۔آخر میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ کبھی بھی کسی کام کا وقت نہیں گزرتا۔جب تک آپ کے جسم میں زندگی کی رمق باقی ہے آپ کے پاس چانس ہے کہ آپ کر سکتے ہیں۔آپ نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں کبھی امیر نہیں ہو سکتا تو آپ ہو سکتے ہیں ۔دیکھیں کہیں آپ دولت کی بے قدری تو نہیں کرنے والے۔آپ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں ،دیکھیں آپ صحت کے معاملے رسک لینے والے تو نہیں۔آپ اپنے بہن بھا ئیوں سے نالاں ہیں دیکھیں آپ کہاں پر غلط ہیں۔دیکھیں

غلط فہمیاں حقیقت نہ بننے پائیں۔آپ کا ذہن بنا دیا گیا تھا کہ آپ کبھی پڑھ نہیں (تعلیم حاصل نہیں) سکتے تو دیکھیں آپ ایسے تو نہیں تھے جو علم کی قدر نہ کرتے ہوں یعنی آپ کو یہ لگتا ہو کہ آپ کا تعلیم حاصل کرنے میں کوئی مفاد نہیں اور ہو اکتا ہے اب آپ کو تعلیم کی ضرورت ہو۔اسی لیے تو کہا گیا ہے علم حاصل کر گود سے گور تک۔تو پھر آج سے کیوں نہیں آپ دوبارہ پڑھنا شروع کرتے آج کیوں نہیں آپ اپنا مقصدِ زندگی طے کر لیتے۔

ہمیں اپنے آج کی بھی قدر کرنی چاہیے تاکہ ہمارا کل زیادہ تابناک ہو۔ہمیں اپنی قدر کرنا ہو گی۔ہمیں اپنی قوم کی قدر کرنا ہو گی۔ہمیں پارک کے ہر اُس گھاس کے تنکے کی قدر کرنا ہو گی جو ہمارے قدموں کے نشیب و فراز کو نرم و گداز سطح مہیا کرتا ہے۔ہمیں اُس وطن کی قدر کرنی چاہیے جو اقوامِ عالم میں ہماری پہچان ہے۔ہمیں اُس آزادی کی قدر کرنی چاہیے جس نے ہمیں غلامی کی لعنت سے نجات بخشی اور اُن بزرگوں کی قدر کرنی چاہیے جنھوں نے ہمارے لیے اپنا آرام و سکون قربان کر دیا اور صبح و شام اُن شہیدوں پر درود وسلام بھیجنا چاہیے جنھوں نے ہمارے لیے اپنا آج اور کل قربان کر دیا۔اُنھوں نے اپنے بچوں کو تو یتیم کر دیا مگر ہمیں یتیمی سے بچالیا اِس ملک کو یتیم و لاوارث نہ ہونے دیا۔اور اگر ہم یوں ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری کرتے رہے تو وہ دن طے شدہ دستور کے مطابق ضرور آئے گا جب ہماری دنیا اور

آخرت کی توقیر جاتی رہے گی۔ قدرت کسی کے لیے بھی اپنا قانون بدلہ نہیں کرتی۔
ہمیں اُوج ثریا سے زمیں پہ آتے دیر نہیں لگے گی۔

سب جنجال جھٹک دو

گئے وقتوں کی بات ہے کسی گاوں میں ایک آدمی کے پاس ایک خچر تھا جو بوڑھا ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن خچر چرتے چرتے ایک خشک کنوئیں کے پاس چلا گیا اور پھسل کر اُس میں جا گرا اُن دنوں کرین نہیں ہوا کرتی تھی ۔ خچر کے مالک نے سوچا کہ یہ جانور ویسے بھی بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کو کنوئیں میں سے نکالنے کے لیے بھی بہت محنت ہو گی ، بہتر ہے کہ میں اس پر مٹی ڈال دوں کنواں بھی بھر جائے گا اور اس جانور سے بھی چُھٹکارا مل جائے گا۔ اُس نے گاوں کے چند نو جوانوں کو لیا اور کنوئیں میں مٹی ڈالنا شروع کر دی جیسے ہی مٹی خچر کی پُشت پر پڑی خچر نے عجیب سا محسوس کیا اور اپنی کمر جھاڑ دی۔ لوگ مٹی ڈالتے گئے اور خچر اسے اپنی پُشت سے جھاڑتا گیا اور اپنے پیروں تلے بچھاتا گیا رفتہ رفتہ خچر اُونچا ہوتا گیا اور پھر وہ وقت آیا کہ وہ آسانی سے چھلانگ لگا کر اس کنوئیں سے باہر آگیا۔

بس دوستو ! دوسروں کے حسد کو، بُغض کو، نفرت کو، روک ٹوک کو، نوک جھونک کو، دل آزاری کو، نقطہ چینی کو اپنی کمر سے جھاڑ کر اپنے پیروں تلے بچھا لو، تو روز بروز اُوپر اُٹھتے جاؤ گئے ، آگے بڑھتے جاؤ گئے ۔ نشان منزل پر

پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر دوسروں کے اس عمل کو دل پہ لگا لو گے تو لوگ تم کو حسد
بغض، نفرت، دل آزاری کی مٹی تلے دبا دیں گے پھر نہ تو آپ ہوں گے اور نہ کوئی،
منزل و مقصد ہو گا۔

چلو پھر سب جنجال جھٹک دو اور جس مقصد کے لیے آپ کو تخلیق کیا گیا ہے اُس کو پانے
کے لیے کمر کس لیں۔

اس دنیا کی آبادی سات ارب سے کچھ اُوپر ہے اور تقریباً تیرہ ارب سے زیادہ ہاتھ
ہوں گئے اور ظاہر ہے کہ ایک کھرب سے زیادہ انگلیاں ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کے
آپ کی انگلی جیسا فنگر پرنٹ کسی اور کا نہیں تو دوستو کچھ تو بات ہو گی جو قدرت نے
بنایا۔ اور کتنے دُکھ کی بات ہو گئی اگر ہم نے اپنی انفرادیت کو باور نہ Unique ہمیں
کرایا۔ اور بن شناخت کے وقت کے قبرستان میں دفن ہو گئے۔

واصف علی سنگت

20 مارچ بروز اتوار بمقام قائدا عظم ڈویژن پبلک سکول (شیخ محمد یونس آڈیٹوریم) گوجرانوالہ میں جناب حضرت واصف علی واصفؒ کی یاد میں واصف خیال سنگت نے اُن کے افکار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک سیمینار کا انعقاد کیا۔ جس میں کم و بیش تمام مکتبہ فکر کے لوگوں نے شرکت کی بلخصوص صوفی منش شخصیات کو مدعو کیا گیا ۔اس محفل کو زینت و رونق بخشنے کے لیے معروف کالم نگار، جناب مُنو بھائی صاحب معروف کالم نگار) ، جناب اوریا مقبول صاحب (معروف کالم نگار) جناب جواد ایس) خواجہ چیف جسٹس آف پاکستان (ر) اور صاحبزادہ واصف علی واصف جناب کاشف محمود صاحب نے نہائت جامع اورپُر اثر انداز سے جناب حضرت واصف علی واصفؒ کے خیالات کو دلوں کی دھڑکنوں میں سمویا۔ جنابِ محترم اوراایا مقبول صاحب کے رنگ نے سب کو دھنگ کر دیا اور کمرہ ہال میں تمام حاضرین کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا آپ نے کچھ اس طرح دلوں کو گرمایا کہ ہر جوان و پیر کا قبلہ درست ہو گیا اور صحیح معنوں میں آپ نے فضاء بدر کو پیدا کر دیا۔ آپ نے درست سمت میں توکل اور شانِ توکل کو اُجاگر کیا۔ جناب مُنو بھائی نے بھی نہائیت دھیمے، تیکھے اورپُر حکمت انداز میں فرقہ واریت کے جن کو بوتل میں بند کرنے کے منتر سمجھائے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل وطن کو یہ شاید چڑیاں

چمک جانے کے بعد یاد آئے۔ جناب جسٹس خواجہ صاحب کے بارے میں میری رائے کی وہ دُرگت بنی کہ اب میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے جسٹس صاحب کے اندر وہ رُعب اور رعونیت نہ پیدا ہونے دی، جو عموماً جج صاحبان کا خاصہ ہوتی ہے۔ شاید ان جیسے درویش صفت جج صاحبان کی وجہ سے ہی ہمارے ملک کے وکلا اتنے شیر اور دلیر ہو گئے ہیں۔ آپ نہائیت سادہ اور فقیرانہ صفت کے درویش ہیں۔

میں اکثر لوگوں سے سنتا تھا کہ پاکستان میں چند ایسے اللہ کے نیک بندے موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک باقی ہے، اور میرے دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہوتا تھا کہ کاش میں ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے حقیقت کے روپ میں دیکھوں اور اللہ نے میری دُعا سن لی اور جناب جواد ایس خواجہ صاحب کو میں نے آپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا اور یقین بھی کرلیا۔ اور اس پر گواہ بھی بن گیا ہوں۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات بھی میرے ایمان کا حصہ بن گئی ہے کہ یہ ارضِ وطن ضرور بہ ضرور باقی رہے گا، قیامت کی سحر ہونے تک (انشاءاللہ) کیونکہ اس کی آغوش میں آج بھی ولیوں کے بیٹے جاگزیں ہیں، جو وقت کے بادشاہ ہونے کے باوجود ایاز کے لباس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جو آج بھی نڈر ہیں۔ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ زمین کے اُوپر ہیں یا زمیں کے اندر، وہ اس خوف سے آزاد ہیں۔ جن کے پاس کوئی سیاسی تماشہ نہیں۔ جن کی گفتگو بھی بے رنگ صاف شفاف وپاک پانی کی طرح ہے جس میں کوئی مصنوعی رنگ اور خوشبو نہیں سوائے سچ کی چمک کے۔

جناب اوریا مقبول صاحب نے توکل کے بارے میں بڑے موثر انداز میں راہنمائی کی اُن کا فرمانا تھا کہ ہم آج جن مصائب کا شکار ہیں در حقیقت وہ ہمارے غیر مرائی شرک کا پیش خیمہ ہے۔ اور سراسر ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ آج ہمارا اللہ کے کارساز ہونے سے زیادہ کسی، ایس۔ ایچ۔ او، ڈی۔ پی۔ او، یا کسی ایم۔ این۔ اے وغیرہ پر زیادہ یقین کامل ہے اور اللہ کی بجائے اُس سے تعلق ہونا زیادہ قابلِ بھروسہ خیال کرتے ہیں۔

یہاں سے میں اپنے خیالات آپ سے شئیر کرنا چاہوں گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ازل سے قانون ہے کہ جب ہم اُس کی کسی نعمت کی قدر نہیں کرتے تو پھر وہ بندے سے وہ نعمت واپس لے لیتا ہے اور اُس کو اغیار کا محتاج کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر ہم آج اپنی آنکھوں کی قدر نہیں کرتے اور اُن کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں کرتے تو مستقبل میں ہم دوسروں کی آنکھوں کے محتاج ہوں گے۔ اسی طرح اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق خود کو جدید علوم سے بہرہ مند نہ کیا تو یقیناً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ اقوام کا محتاج ہونا پڑے گا۔اور پھر کیا وجہ ہے کہ ہم پر ذلت کا عذاب نہ نازل کیا جائے۔ اور بلحاظ قوم اگر آج بھی ہم نے میانہ روی کی راہ اختیار نہ کی تو پھر ہمارے اُوپر آپ ﷺ کی وہ حدیث کیسے نہ صادق آئے کہ جس کو منکر بھی صادق اور امین

کہتے تھے ، کہ جس نے اپنی ضرورت کے لیے ایک بار کسی غیر کے آگے ہاتھ پھیلایا تو اللہ اُس کے لیے فقر و محتاجی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم آئی۔ایم۔ایف کے محتاج ہوں اور کیوں نہ ہم پہ زکوٰۃ سکیموں کے دروازے کھول دیے جائیں اور پھر کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے کہ ہم ان ایک دو ہزار کے لیے صبح سے شام تک قطاروں میں بھوکے پیاسے نڈھال نہ ہوں۔پیدائش سے موت تک وہ کونسا مرحلہ ہے جہاں ہم میانہ روی سے چلتے ہیں۔ کبھی ہم مجبور ہو جاتے ہیں اور کبھی کر دیے جاتے ہیں۔ بہر حال ہم جتنی جلدی اس نقطہ کو سمجھ لیں گے اُتنی جلدی اغیار کی محتاجی اور ذلت سے نجات پالیں گے۔ اور اُتنی جلدی ہم پر اللہ کے خزانوں کے منہ کھول دئے جائیں گے۔آج بھی اُس کے خزانوں میں کمی نہیں آئی بس ہم نے ہی اُس کا در چھوڑ دیا ہے ۔اللہ کی صفات میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ خود پہلے اپنے بندے کو نہیں چھوڑتا بلکہ بندہ اُسے چھوڑنے میں پہل کرتا ہے۔ بس پھر وہ بھی بے نیاز ہے وہ خدا ہے اُس کو شایاں نہیں کہ وہ اپنی مخلوق سے انتقام یا بدلہ لے وہ تو بس اُس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور پھر نہ زمیں کی گہرائیوں میں اُس کا کوئی داماں ہوتا ہے اور نہ افلاک کی وسعتوں میں اُس کا تدارک۔ ایک ذلت کے بعد دوسری ذلت اور پھر تہہ در تہہ ذلت ہی ذلت (خدا مجھے اور اُمت محمدی ﷺ کی دستگیری کرے) کوئی نہیں جو پھر اُس کے سامنے ٹھہر سکے۔ قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اُن کے

دلوں کی کیفیت نہ بدل جائے اور وہ خود اُسے بدلنے کا ارادہ نہ کرلیں۔ اللہ کرے ہمیں جس قدر نیک لوگوں سے پیار و محبت ہے اُس سے کہیں زیادہ شدت سے اُن کی تعلیمات پر عمل کرنا نصیب ہو۔ (آمین)

آؤ نئی بات کریں

ایک مرتبہ گوتم بدھ اپنے پیروکاروں کے ساتھ کسی گاؤں کے قریب ایک جنگل میں بیٹھا واعظ و تبلیغ میں مصروف تھا کہ ایک دیہاتی اُس کے سامنے آکھڑا ہوا اور پوچھا تم میں سے بدھا کون ہے ؟ گوتم بدھا نے سر کی جنبش سے جواب دیا کہ میں بدھا ہوں ۔اُس دیہاتی کی آنکھیں غصے سے تن گئیں اور اُس نے نہائت حقارت سے بدھا کے چہرے پر تھوک دیا۔

اُس کے پیروکاروں کو غصہ آگیا اور اُس کے ایک قریبی ساتھی اشوکا نے اُس دیہاتی کی گستاخی پر اُسے پکڑ کر مارنا چاہا، مگر بدھا نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ پھر گوتم بدھ اپنے پیروکاروں سے مخاطب ہوا اور کہا کہ درحقیقت اس نے میرے چہرے پر اپنی نفرت نہیں کسی دوسرے کی نفرت اُنڈیلی ہے نہ تو میں اس کو جانتا ہوں اور نہ اس کو میری پہچان ہے۔ یہاں تک کہ اس مجمع میں بھی اس کو مجھے شناخت کرنے میں دقت ہوئی ہے۔ یہ کسی اور کا حسد اور نفرت ہے جو اُس نے اس کے سینے میں بھر دی تھی اور آج اس نے مجھے تلاش کرکے وہ میرے چہرے پر اُنڈیل دی ہے۔

بدھا نے اُس دیہاتی سے کہا، '' جاؤ مجھے تم سے کوئی انتقام نہیں لینا''۔
وہ دیہاتی واپس گاؤں لَوٹ آیا مگر ساری رات احساس ندامت نے اُسے سونے نہ دیا۔ صبح وہ دوبارہ جنگل گیا اور بُدھا کے سامنے کھڑے ہو کر بولا اے نیک فطرت شخص میں تیرے مقام سے بے خبر تھا، ''مجھے مُعاف کر دو''۔
گوتم بدھ نے اُس شخص کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا اور کہا، '' تم کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟''اس دیہاتی نے کہا، ''گزشتہ کل میں نے آپ کے چہرے پر تھوکا تھا مجھے اس بات کا بڑا رنج ہے۔'' گوتم مُسکرایا اور کہا، '' میں تمھیں نہیں جانتا جس کے چہرے پر تھوکا گیا تھا وہ کوئی اور تھا اور جس نے تھوکا تھا وہ بھی کوئی اور تھا میں اور تم آج ملے ہیں۔ انسان کے اندر کا انسان روز بدلتا رہتا ہے جیسے ہم دریا کے کنارے کھڑے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ وہ ہی دریا ہے جس کے کنارے ہم کل کھڑے تھے حالانکہ وہ کل والا دریا نہیں ہوتا۔ اُس کے اندر کا سارا پانی تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور اُس کی جگہ دوسرا پانی ہوتا ہے جس پر ہم پتھر پھینک رہے ہوتے ہیں۔''

''پس تم بھی نئے ہو اور میں بھی نیا ہوں آؤ کوئی نئی بات کریں۔''

قارین! مقصد جتنا بڑا ہوتا ہے اُس کے لیے ہمیں اُتنی ہی بڑی مخالفت درپیش ہوتی ہے۔اور جب ہم اس مخالفت کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے اتنی ہی بڑی قربانی بھی دینا پڑتی ہے۔ یہ قربانی تضحیک، قطع تعلّق، تشدد، اپنے عزیزوں کی جدائی، بلیک میلنگ اور لاتعداد صدموں کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ مگر آفریں ہے اُوج ثریا کے اُن ستاروں پر جو ذرا بھی مدھم نہیں ہوتے اور اپنے گردو پیش کو بقا نور بناتے رہتے ہیں۔ سسکیوں کو مسرتوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ رات کے وجود سے دن تراشتے رہتے ہیں۔ بانجھ زمیں کی آغوش میں گلستاں اگاتے جاتے ہیں۔ مشکل ر استوں کو آساں بناتے جاتے ہیں۔ ان ہی کے دم سے پھر نئے جہاں آباد ہوتے جاتے ہیں۔

اور جو لوگ معاف کر دینے کے ظرف سے بے بہرہ ہوتے ہیں یہ ہی لوگ مسرتوں کو نوچ کر آہوں کو عیاں کرتے ہیں۔ نخلستانوں کو ریگستانوں میں بدل دیتے ہیں۔ وہ جو خوبصورت چہرے بناتا ہے وہ جو گم نام پانی سے باسم انساں بناتا ہے۔ اُسی کا نام لے کر انساں ہی انساں کو کاٹ دیتا ہے۔ معصوم غنچوں کے حلقوم پہ کس بربریت سے وہ خنجر چلاتا ہے۔ خود تو غرق ہے دوزخ کے نہاں خانوں میں، بھلا اس بدبختی کا وہ بدلہ کیوں پھولوں سے لیتا ہے۔ وہ یہ کیوں

نہیں کہہ دیتا تم بھی نئے ہو میں بھی نیا ہوں آو کوئی نئی بات کرتے ہیں۔ بھلا ہم کیوں لڑتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا فقرا ایک حیوان کو انسان بنا سکتا ہے۔

معلوم اور نا معلوم

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام اور حوّا علیہ السلام کو جنت عطا کی تو اُن کو ایک درخت کے سوا تمام انوع و اقسام کے میوے کھانے کی اجازت مرحمت فرما دی ۔ کچھ عرصہ تو آپ اس سے دور رہے مگر دوری روز بروز ہجر کی شکل اختیار کر گئی اور آخر اس تڑپ نے کہ اس درخت میں ایسی کیا بات ہے؟آدم کو اُکسایا اور شیطان نے اُسے اُمید اور ترغیب دلائی اور حضرت انساں نے اُس درخت کا میوہ چکھ لیا۔ یہ دُنیا اور اس میں موجود آسائش و مصائب اُس میوے کا ذائقہ ہے جو تا قیامت اولاد آدم کے منہ سے نہیں جائے گا۔

اب ایک اور کہانی کو دیکھتے ہیں ، دُنیا کا کوئی ایک جزیرہ ہے جس کے باسی جدید دنیا اور مذہب سے بلکل ناآشناں ہیں یہ لوگ برہنا رہتے ہیں رشتوں کا کوئی تصور نہیں ۔ماں اور بچے کا رشتہ صرف اُس وقت تک کے لیے ہے جب تک بچہ چلنا نہیں شروع کرتا اور بس اُس کے بعد کون ماں ؟ اور کون بچہ ؟ اس قبلیے کے لوگوں کی کیا اخلاقیات ہو گی اور کیا معاش ؟آپ باخوبی سمجھ سکتے ہیں ۔

اب ایک اور کہانی کو دیکھیں جہاں لوگوں کو سمجھانے کے لیے معلم بھیجے گئے جنھوں نے بتایا ماں کا کیا مقام ہے اور باپ کا کیا مقام ہے بہن کی کیا حُرمت ہے۔ اور بیٹی کا کیا تقدس ہے۔ شریک حیات کا انتخاب کیسے ہوگا۔ پھر کمیونٹی کے کیا حقوق ہونگے۔ یہ سب احکام بجا لانے کا صلہ کیا ہوگا؟ان تین حوالوں کا تجزیہ کریں تو جو جواب ہمارے حصے میں آئے گا وہ یہ ہے کہ معلوم اور نا معلوم کا فرق ہی گناہ اور ثواب ہے۔ جو چیز ہمارے معلوم سے باہر ہے وہ کچھ بھی نہیں اور جو چیز ہمیں معلوم ہے۔ اُس کی تکذیب و تائید ہی اصل میں گناہ اور ثواب ہے۔ کن اعمال کی ادائیگی یا کن اعمال سے پرہیز کرنا گناہ یا ثواب ہے یہ ابھی ہمارا موضوع نہیں ہے۔

اب ہم یا جدید دنیا جس ماحول میں رہ رہی ہے وہاں نا معلوم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔سب معلوم ہی معلوم ہے پھر کیوں آج انسان غار کے انسان سے زیادہ غیر محفوظ ہے؟آج اگر چرچ، مندر یا مسجد کو بم سے اُڑانا جائز ہے اور ایسا ہو رہا ہے تو کہاں ہے تعلیم؟ اور اگر مذہب کی بنیاد پر حقوق و فرائض تقسیم ہیں تو آج کے مُہذب انسان کی تربیت کیا ہوئی؟ اقوام متحدہ کہاں، متحد ہیں؟انسان کا دُکھ نوالہ نہیں ہے۔ تشخص ہے جو قدرت اُس کو دے کر بھیجتی ہے۔اُسے لاکھ زمین کے ٹکڑوں، جلد کی رنگت،زبان اور نسل میں تقسیم کرو مگر وہ ایک اکائی ہے۔ ماں ہر ملک میں ماں ہے، بیٹی ہر قوم میں بیٹی

ہے، بہن ہر رنگ میں بہن ہے، ہر نسل میں بچوں کو پھول ہی کہا جاتا ہے۔ہر جان کی حُرمت ہے۔ کیا مذہب ،زبان ،رنگ، قومیت اور علاقہ تبدیل ہونے کے ساتھ ہی میری بیٹی،ماں ، بہن، بھائی میری زندگی (جو اُس پروردیگار کی عنائیت ہے جو جانتا ہے کہ میں کب کونسا مذہب اور فرقہ اختیار کروں گا۔ پھر بھی میں واجب والقتل ہوں) سب انسانیت سے خارج ہو جاتے ہیں۔اتنا سخت تو وہ انسان بھی نہیں تھا جسے تم مُہذب لوگ وحشی کہتے ہو۔ایک وقت تھا جب بیت اللہ غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا اُسے فتح تو کیا گیا مگر تباہ نہیں۔ مگر آج تو مسجد نبویؑ اور بیت اللہ کے در و دیوار بھی دہشت زدہ ہیں اتنے دہشت زدہ تو ابراہا کے ہاتھیوں کے لشکر سے بھی نہ ہوئے تھے۔

میں گناہ اور ثواب کی تعریفوں سے بدزن ہوگیا ہوں کہ ہر گروہ کی اپنی ہی وضع کردہ تعریف ہے۔اس لیے عہد کُہن کی تعریف کو کسوٹی بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ کہ شاید کسی پہ اثر کر جائے۔ اچھی بات ہر کوئی جانتا ہے مگر اچھے عمل سے عاری ہے کیا اقوام عالم اور کیا قوم مسلم۔انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اُس کا تشخص ہے۔ سارے فنڈ ساری پر لگا دو۔پھر دیکھو ہر کالے اور گورے عربی اور عجمی کا Human respect ذہانت فقط مسئلہ کیسے حل ہوتا ہے۔گناہ کی کسوٹی معلوم اور نا معلوم کو بناو۔آدم کو معلوم تھا اس درخت کا پھل نہیں کھانا، پھر کھایا توگناہگار چاہیے پیغمبر اور جدامجد تھا۔ اسے

کہتے ہیں قانون ! اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ ہم آدم ہیں ، یا وہ قبیلہ جس تک ہدایت اور تعلیم نہیں آئی ، مگر یاد رکھیں پھر آپ کی بھی ماں ، بہن ، بیٹی نہیں ہونی چاہیے اور اگر آج میں آپ کے مذہب اور فرقے میں واجب القتل ہوں تو کل آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ اختتام کہاں ہو گا یقیناً جہاں انسان ختم ہو گا۔ انسانیت تو کب کی ناپید ہو چکی دیکھتے ہیں انسان کس روز صفحہ ہستی سے ناپید ہوتا ہے۔

وفاداریں

کسی جنگل میں ایک عمر رسیدہ ویران اور خشک درخت تھا جس پر صرف ایک ہی پر
ندے کا سالوں سے بسیرا تھا۔ ایک دن نا جانے پرندے کے دل میں کیا آئی وہ بیٹھے
بیٹھے درخت سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو سب پرندے تم کو چھوڑ کر جا چکے مگر میرے
دل نے کبھی یہ منظور نہیں کیا کہ تم کو چھوڑ کر چلا جاؤں اور تیرے ساتھ بے وفائی
کروں۔ نہ جانے خُدا نے میرے دل میں کیا بھر دیا ہے کہ میں چاہوں بھی تو تجھ
سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔“ پرندے کی بات سن کر درخت کے اندر سے تڑتڑاہٹ
کی سی آواز آئی اور پورا درخت جھول گیا۔ درخت کے لرزتے ہی پرندہ بے ساختہ اُڑ گیا
مگر جب درخت ساقط ہوا تو پرندہ دوبارہ شاخ پر آن بیٹھا۔ درخت نے گہری سانس
لی اور فضا میں کئی لٹر آکسیجن خارج کر دی۔ پرندے نے اس ٹھنڈی آکسیجن میں سانس
لیا اور اپنے اندر کا زہر (کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شکل میں) باہر اُنڈیل دیا۔
کچھ لمحے دونوں طرف گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر درخت نے یہ سکوت توڑا اور
بولا” میں بھی کتنا نادان ہوں، میرے دل میں بہت بار یہ خیال آیا کہ کب تک یہ
زندگی کا بوسیدہ بوجھ اُٹھائے رکھوں گا۔ کب تک فضا سے

زہر چوس کر اسے زندگی (آکسیجن) میں تبدیل کرتا رہوں گا۔ کب تک اُس بوڑھے آدمی کا چولہا اپنی خشک شاخوں سے گرم رکھوں گا اور کب تک میں ان پرندوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے رکھوں گا، کب تک یہ میرے پھول اور پھل نوچ نوچ کر کھاتے رہیں گے اور کب تک میں انہیں بادوباراں سے بچاتا رہوں گا۔ میں کیوں نہ اب تھک کر لیٹ جاؤں اور کیوں نہ بیج بن کر نیا رُوپ لے لوں۔ مگر پھر میں خود سے یہ کہہ کر اپنے اندر زندگی کی تھمتی ہوئی رمک کو تیز کر لیتا ہوں کہ اُس بوڑھے کو خشک لکڑی نہ ملی تو اُس کا چولہا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں گروں گا تو کتنے گھونسلے میں پڑے معصوم بچے گر یں گے۔ جس سے بے چارے پرندے کا دل غم سے پھٹ جائے گا۔ ان جواں ہوتے بچوں کو سرخ خون کی ضرورت ہے اور یہ خون آکسیجن سے سُرخ ہوگا۔ میں گرا تو یہ پرندہ بے سہارا ہو جائے گا شاید پھر کوئی اور میری طرح اس کا خیال نہ رکھ پائے۔

تم پرندے ہو ہاں شاید تم اُڑ کر کہیں اور بھی بسیرا کر سکتے ہو میری ایک جنبش پر ہی دیکھو تم کیسے فوراً سے اُڑ پڑے، تم نے پہلے اپنے بارے میں سوچا تم نے یہ نہیں سوچا کہ مدتوں میں جس درخت پر بسیرا کیے ہوئے ہوں آخر اُس کو کیا ہوا کہ وہ لرز گیا۔ اگر تم سوچتے بھی تو شاید اتنا ہی سوچتے کہ یہ درخت بوڑھا اور بوُسیدہ ہو گیا تھا اس نے تو گرنا ہی تھا۔

مگر ہم درخت اور پودے ایسا نہیں کرتے ہمیں جو بُوتا ہے اور جو سینچتا ہے، جب وہ اپنا ہاتھ ہم پر پھیرتا ہے تو ہم خوش ہوتے ہیں وہ ہمیں سیراب کرتا ہے تو ہم جھوم جاتے ہیں، مگر جب ہمارا مالی ہی ہمیں چھوڑ جائے تو ہم اُس کی یاد میں رفتہ رفتہ مرجھانا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ کہہ کر درخت خاموش ہو گیا اور پرندہ گہری سوچ میں ڈوب گیا، اُس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وفادار کون ہے؟ میں یا درخت؟

دوستو! مانا کہ جس پر ہمارا آشیانہ ہے اُس کی جڑیں کھوکھلی ہیں مانا کہ بہت سے لوگ اُس کو چھوڑ کر جا چکے ہیں اور جا رہے ہیں مانا کہ ہمیں وہ سب نہ مل سکا جو دوسروں کو اُن کے وطن نے دیا۔ مانا آج ارضِ وطن پہ خزاں کا دور ہے مگر کیا یہ کم ہے کہ یہ اپنا گھر ہے؟ کیا پوری دُنیا کا چکر لگانے کے بعد جب اپنے وطن (گھر) کو لوٹتے ہیں تو ایک سکون اور تحفظ کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم کیا تھے؟ مصریوں کے لیے مصر، افغانی کے لیے افغانستان، عربی کے لیے عرب۔ ہم مسلمان ہو کر بھی ہندوستانی تھے۔ کیا یہ کم ہے کہ ہم گائے ذبح کرنے پر ذبح نہیں ہوتے؟ کیا آج ہمارا ایمان اور آبرو اس کی

چار دیواری میں محفوظ نہیں ؟ کیا اس کے کھیتوں نے ہمیں پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن
ڈھانپنے کو لباس نہیں دیا ؟
کون کتنا وفادار ہے ؟ یہ ہم نے سوچنا ہے یا وطن نے ؟
آو پھر اپنے حصے کا کام کریں اپنے اجداد کا ادھورا خواب پورا کریں ۔
دہشت کے سمندر سے امن کا موتی نکالیں گے
اے دنیا تو نے ابھی یہ معجزہ بھی دیکھنا ہے
میں ننھا سا پھول مہمان ہوں چند ساعتوں کا
مگر اے گلشن تجھے قیامت کی سحر کو دیکھنا ہے

حماقتیں

اگر ہم ایک ایک کرکے دنیا کے تمام عقلمند لوگوں کی زندگیوں پر ریسرچ کریں کہ آیا اُن کے اندر عقل و دانش کہاں سے آئی ؟ تو یہ جان کر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ یہ عقل ودانش در حقیقت حماقت کے بیج سے پُھوٹی ہے۔ عقلمندی کے صرف دو ذرائع ہیں ایک یہ کہ آپ حماقت کریں (بویں) اور پھر اس پر لگنے والا عقلمندی کا میوہ کھائیں ،دوسرا آپ احمق کو دیکھیں اور اُس کی حماقت کے بیج سے عقل کا پھل کھائیں۔ اس بحث سے بالاتر کہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اچھی حماقت کیا ہے؟ اور بُری حماقت کیا ہے ؟ اصل میں حماقت حماقت ہی ہوتی ہے۔ بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ حماقت آدم سے ہو جائے تو وہ معافی مانگ لیتا ہے ،اور یہ جنت سے جنت تک کا سفر ہے اور اگر یہ حماقت شیطان سے ہو جائے تو وہ ابلیس بن جاتا ہے جہاں وہ محرم سے محروم اور مجرم بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی صورت حال ہے جہاں ہم حماقت کو ظاہری اور حقیقی معنی بھی دے سکتے ہیں بس اس سے زیادہ نہیں سوچنا۔ ورنہ یہ بھی ایک حماقت ہوگی۔

دنیا میں جتنے بھی عظیم لوگ گزرے ہیں وہ اُس دور کے لحاظ سے حماقت کر رہے

تھے۔ پھر بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ دراصل یہ اُن کی حماقت ہی تھی جس نے اُن کو دوسروں سے مختلف اور معزز بنایا۔ یہ حماقتیں ہی تھیں جنھوں نے ایڈیسن کو ایجادات کا باپ بنایا اور صدی کا سب سے عظیم سائنسدان کا لقب ملا۔ سقراط کا زہر کا پیالا پینا بھی حماقت تھی۔اگر سقراط یہ حماقت نہ کرتا تو ہمارا خدا کون ہو گا؟ اس کا فیصلہ بھی ریاست کرتی۔اگر مجنوں لیلہ سے محبت کرنے کی حماقت نہ کرتا تو پھر دنیا میں صرف چند چہرے ہی چاہے جا سکتے۔اور اگر شہزادہ گوتم تاج و تخت چھوڑنے کی حماقت نہ کرتا تو اُس سچ تک نہ پہنچ سکتا کہ دنیا کا امن ''سب برابر ہیں''۔کے فلسفے میں ہے۔اور آج 360 ملین لوگ اُس کے نام کی اگربتیاں نہ جلاتے۔بل گیٹس کا آئیڈیا حماقت کے سوا کچھ نہ تھا پھر یہ حماقت کھربوں ڈالر کی ذہانت میں تبدیل ہو گئی۔آدم نے حماقت کی پھر ابن آدم نے پھر ابن آدم بن ابن آدم نے یوں آج اولاد آدم اس قابل ہوئی کہ وہ سمندر کے پیٹ میں پکنک منائے،وہ اس قابل ہوئی کہ فضاؤں پہ پر وار کرے۔ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ نے جب اہل عرب کو کہا کہ اللہ تو صرف ایک ہی ہے نہ اُس کا کوئی عکس ہے نہ بُت،وہ وہ ذات ہے جو انسان کے بیاں سے بالا ہے بشر میں وہ مادہ وفن ہی نہیں کہ اُس ذات کا ادراک کر سکے تم کہاں گارے اور پتھروں، کے بے ہنگم بتوں کو سجدہ کر رہے ہو جو خُود تمہارے وجود سے بھی کم تر ہیں،بھلا یہ کیسے تم پر حاکیت قائم کر سکتے ہیں؟اُس دور کے بڑے بڑے عقل ودانش میں مست دماغوں کا بھی

اہل ایمان کے بارے میں یہی کہنا تھا"کیا ہم ایمان لائیں جیسے احمق ایمان لائے" (البقرا ۱۳)

تو دوستو گھبراؤ نہیں ،پچھتاؤ نہیں اگر حماقت ہو گئی، تو وہ خدا بڑا رحیم و کریم ہے اُس کے خزانوں میں کمی نہیں وہ معاف کر دے گا کوئی بات نہیں اگر ایک حماقت سے کاروبار تباہ بھی ہو گیا،اور ایک حماقت سے ایک رشتہ اور تعلق ٹوٹ بھی گیا،اللہ کی زمیں اور اُس کی رحمت بہت کُشادہ ہے۔اُٹھو اور اب اسی حماقت کے پھل سے ایک نئی دنیا بساؤ،ایک نیا کاروبار جماؤ۔ناکامی کی حماقت ہی دراصل کامیابی کی کُنجی ہے ۔حماقت کا رستہ ہی تجھے عقل کی منزل تک لے کر جائے گا۔جو خیال دل میں ہے اُسے زباں کا گیت بناؤ۔لوگ دیوانہ کہتے ہیں تو کہنے دو کچھ پروا نہیں ۔ وہ جو خاص صرف تم ہی ہو ۔وہ راز اب اُچھال دو۔بے شمار لوگ ہیں اس دنیا میں اُن میں سے ایک تم بھی ہو ۔اس کے باوجود کے دنیا میں اتنے لوگ ہیں پھر بھی تم پیدا کیے گے ،کیوں؟اس کیوں کا جواب تم دو؟ شجر و حجر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ایک پھول کا مقصد فضا کو معطر کرنا تھا سو اُس نے کیا اور چلا گیا۔ایک پھول کا مقصد لحد پہ بکھرنا تھا سو اُس نے کیا۔ وہ اشرف نہیں تھے اُن کو بتانا پڑا۔اے انساں تو اشرف ہے تجھے خود ہی اپنی خودی کو پانا ہے یہ تیرا اشرف اور عزت ہے کہ تیرے رب نے تجھے کہہ دیا کہ جو تو چاہے گا میں تجھے ویسا کر دوں گا۔بقول واصف

علی واصف کہ تُو جتنا خدا سے راضی ہے خدا بھی تم سے اُتنا ہی راضی ہے۔ اور اسی رضا کا صلہ دنیا و آخرت کی عزت ہے۔